ڈاکٹر واثق الخیر
Managing Editor, Tareekh e Adab e Urdu, Delhi

ریت سمادھی: انسان دوست ناول

تلخیص:

گیتانجلی شری کا ناول ’ریت سمادھی‘ جسے انٹرنیشنل بکر پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ ۷۳۹ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۸۰ سالہ عورت کے پس پشت چلنے والی کہانی ہے۔ یہ کہانی دہلی سے شروع ہوتی ہے کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے پاکستان پہنچتی ہے۔ اس ناول میں سب کچھ ہے۔ اس میں زندگی ہے، موت ہے اور بہت گہرا مطالعہ ہے۔ رشتوں کے تانے بانے میں بُنا یہ ناول بہت سے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرے کی ان توقعات کو بھی ظاہر کرتا ہے جو روایتی طور پر عورت سے رکھتی ہیں۔ اخلاقی پولیسنگ سے پیدا ہونے والے تنازعات، پدرانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی نرم آواز سے سیاست کے دوغلے پن تک، ماحول کی فکر، فرقہ واریت، تقسیم، محبت کی آواز کے ساتھ ساتھ ہندو و پاک کی سیاست بھی اس ناول میں سامنے آتی ہے۔ زبان و بیان کا نرالا انداز ہے جو اس ناول کی خاص خوبی ہے۔

کلیدی الفاظ: معاشرہ، پدرانہ نظام، مردانگی، حقوق نسواں، سیاست، ماحولیات، فرقہ واریت، خواجہ سراء، تقسیم، ہندو پاک کی سیاست، رشتے، جذبات، ستم ظریفی، علیحدگی اور خوابوں کی توقعات۔

ہندی کی مشہور ادیبہ گیتانجلی شری کا ”ریت سمادھی“ پانچواں ناول ہے۔ اس سے پہلے ان کے چار ناول ’مائی‘، ’ہمارا شہر اس برس‘، ’تیروہت‘ اور ’خالی جگہ‘ شائع ہو چکے ہیں۔ گیتانجلی شری نے کئی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ یہ کہانیاں مجموعہ کی صورت میں ’انوگونج‘، ’ویراگیہ‘ اور ’یہاں ہاتھی رہتے تھے‘ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نمائندہ کہانیوں کا ایک الگ مجموعہ ’پرتی نیدھی کہانیاں‘ کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی کہانی میں پُر جوش اور نفسیاتی تجزیے کا جادو چھایا ہوا ہے۔ ناول ’ریت سمادھی‘ کا ترجمہ ڈیزی راک ویل نے انگریزی میں کیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ناول شمالی ہندوستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور اس میں ایک ۸۰ سالہ

بزرگ خاتون کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں ہر وہ چیز ہے جو ناول کو عمدہ بناتا ہے۔

گیتانجلی شری کا کہنا ہے کہ وہ چار لائنوں میں نہیں بتا سکتی کہ اس ناول کی کہانی کیا ہے، کیونکہ یہ ایک 'کہانی' نہیں ہے۔ اس کے ہر صفحے پر ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔ اس میں ہر پیراگراف میں ایک نیا کردار داخل ہوتا ہے اور اپنی کہانی سنانے لگتا ہے۔ بے جان چیزیں بھی اس میں زندہ ہو جاتی ہیں، اور اپنی کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ گھر کا دروازہ، دیواریں، لاٹھی، درخت اور پودے، پرندے اور تتلیاں اور ریت اور ہوا۔

ریت سمادھی ویسے یہ ایک عام ناول ہے اور اس میں ایک مرکزی کہانی ہے جس میں کئی ذیلی کہانیاں ہیں۔ جس طرح سے یہ کہانیاں سنائی جاتی ہیں (یا لکھی جاتی ہیں) اس میں کتھا لوک کے ساتھ ایک وسیع کاویہ لوک بھی ہے۔ اس ناول میں ایک الگ قسم کی کہانی بھی ہے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور انوکھی تصویروں کی انگلی پکڑ کر ذہن کی ناہموار گہرائیوں میں اتر جانے کی کہانی ہے، جہاں کبھی آسمان، گھر، پرندہ، کبھی اندھیرا، بے چینی اور چیخ و پکار۔ کبھی کبھی دکھ ہے اور کبھی تکلیف۔ تو بس یوں کہہ لیجیے کہ یہ ناول ایک مکمل خیال ہے، جو پوری طرح سے بھرا ہوا ہے، اتنا ہی خالی ہے جتنا ہونا چاہیے اور اتنا بھرا ہوا ہے کہ جتنا کہ اس کا خالی پن زور زور سے بولے، اس کے الفاظ گونج اٹھیں۔

ناول 'ریت سمادھی' میں کس طرح ایک عام ہندوستانی خاندان کی عورت، جو ڈپریشن کا شکار ہے، سرحد پار کر کے پاکستان آنے کا فیصلہ کیسے کرتی ہے، کس طرح وہ خود کو اس ڈپریشن سے نکالتی ہے۔ اپنے ہنر میں یہ ناول تحریر کی بہت سی بنی ہوئی حدود کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج میں نئے پیرایہ بھی پیدا کرتا ہے۔ ناول رشتوں کے تانے بانے میں بہت سے مسائل کی کھوج کرتا ہے۔ معاشرے کی عورت سے توقعات، اپنے طے شدہ راستے سے ہٹنے سے پیدا ہونے والا تنازعہ، پدرانہ نظام، مردانگی، حقوق نسواں، سیاست، ماحولیات، فرقہ واریت، خواجہ سراء کے مسائل، برین ڈرین، تقسیم، ہند و پاک کی سیاست اور محبت بھی۔ ناول 'ریت سمادھی' رشتوں کے بہت قریب تر ہے۔ متوسط طبقے کے خاندان کے معمولات، رشتوں، دلائل، جذبات، ستم ظریفی، لگاؤ، علیحدگی اور خوابوں کی توقعات کی عکاسی کرتی ہے۔ ایسے گھرانے کی دو عورتیں، ایک بیٹی اور ایک ماں، ایک عمر میں بڑی اور چھوٹی، ایک سنجیدہ اور ذمہ دار اور دوسری آزاد اور آباد، کہانی کا محور ہیں جن پر پورا ناول گھومتا ہے۔ ریت سمادھی میں ماں اور بیٹی کے رشتے کو بڑی باریک بینی سے تراشا گیا ہے۔ یہ ناول بہت سے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ محبت، سیاست، پدرانہ نظام، معاشرے میں خواتین کی حالت، خواجہ سرا، پاکستان، تقسیم، فطرت سب کچھ ایک ناول میں ہے۔ دہلی کی گلی جیسے عام

گھر سے سرحد پار پاکستان تک کیسے پہنچتی ہے اس کی کہانی سنسنی خیز ہے۔ پورا ناول ایک فلم کی طرح چلتی ہے۔ اس کا یو ایس پی یہ ہے کہ آپ ہر صفحے کو پلٹتے ہیں نئے تجسس کو جنم دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رشتوں اور جدوجہد کے باریک ریشوں سے بنے اس ناول کے بارے میں چار سطروں میں بتانا ممکن نہیں۔ دراصل، آپ کو اس ناول کے ہر صفحے پر بہت سے نئے کردار ملتے ہیں۔ کبھی کبھی گھر میں پڑی بے جان چیزیں بھی زندہ ہو کر اپنی کہانی سنانے لگتی ہیں۔

اس ناول کے مرکز میں ایک اسی سالہ خاتون ہے جس کا شوہر فوت ہو چکا ہے۔ اس موت کے بعد پرانی کہانی کی عورت ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ ڈپریشن اس قدر شدید ہے کہ وہ اپنے کمرے سے نکلنا بھی نہیں چاہتی۔ پورا خاندان مختلف طریقوں سے اس کی منتیں کر رہا ہے۔ بیٹا اپنے انداز میں اور بیٹی اپنے انداز میں التجا کرتی ہے کہ وہ کم از کم اپنے کمرے سے باہر آ جائیں۔ لیکن خاتون نے خود کو ایسے خول میں بند کر رکھا ہے کہ وہ باہر نکلنے سے ڈر رہی ہے۔ پھر ان کے الفاظ کی آواز بدلتی ہے، اب وہ نہیں نکلیں گی۔ عورت جاگ اٹھیں۔ بالکل نیا نیا بچپن، نئی نئی جوانی، ممنوعات اور سماجی ممنوعات سے پاک، نئے رشتوں اور نئے تناظر میں بالکل آزاد۔ ہر عام عورت میں ایک غیر معمولی عورت کی عظیم داستان چھپی ہوئی ہے، ریت کی سمادھی، پھر مشترکہ خاندان کی حالت، ملک کی حالت اور عام انسانی تقدیر کی واحد نمائندگی۔ اور ایک لافانی محبت کی کہانی اور روزی جیسا ناقابل فراموش کردار۔ اس ناول میں کہانی لکھنے میں ایک نئی باریکیت ہے۔ اس کی کہانی، اس کی تاریخ، اس کی حساسیت، اس کا بیانیہ، سب کچھ منفرد انداز میں سامنے آتا ہے۔ ہماری حدود اور خاندانی حدود کو پار کرنا۔ یہاں کا مانوس بھی بالکل منفرد اور نیا ہے۔ ان کی دنیا اتنی ہی جادوئی ہے جتنی جانی پہچانی ہے، دونوں کے درمیان فرق کو دھندلا کر رہی ہے۔ یہاں بھی وقت اپنے تسلسل میں آتا ہے۔ ہر وجود ماضی کی ہستیوں کو گلے لگاتا ہے اور ہر لمحہ صدیوں سے سو رہا ہے۔ مثال کے طور پر، واہگہ بارڈر پر ہر رات ہونے والے جارحانہ ہندوستانی اور پاکستانی قوم پرست مظاہرے ''ذبح کی بھول بلیا سے واپس آنے والی آوازوں'' میں دہرائے جاتے ہیں اور وقت کا طویل سایہ مشترکہ خاندان کی روزمرہ کی زندگی تک محدود ہے۔ اور بھی حدود ہیں جو اس ناول کو منفرد بناتی ہیں، جیسے مرد اور عورت، جوان اور بوڑھے، جسم اور دماغ، محبت اور نفرت، نیند اور بیداری، مشترکہ اور جوہری خاندان۔ ہندوستان اور پاکستان، انسان اور دوسرے جانور (یہ بے وجہ نہیں ہے کہ یہ کہانی کبھی کبھی تتلی، کوے، تیتر، یا کسی قدیم سڑک یا دروازے کی آواز کو سنائی جاتی ہے) یا نثر اور شاعری میں، شکل میں دھم کے آنسو پتھروں کی بارش کے قطروں سے گرتے ہیں۔

ناول میں آپ کو رشتوں کی ایک بالکل عجیب دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی دوران اچانک بوڑھی عورت پاکستان جانے کا سوچتی ہے۔ وہاں انہیں روزی نامی خاتون کی کچھ اشیاء حوالے کرنی ہیں۔ جیسے جیسے آپ اس ناول کو پڑھیں گے، آپ محسوس کریں گے کہ یہ کیسے ایک سادہ سی عورت کی کہانی بھی ہے، کیسی سرحدوں کی کہانی بھی ہے اور کیسے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کی نفسیاتی داستان بھی ہے۔ یہ تاریخ کی کہانی ہے۔

رشتوں کے تانے بانے میں بُنا یہ ناول بہت سے مسائل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ہندوستان سے پاکستان کا سفر معاشرے کی ان توقعات کو بھی ظاہر کرتا ہے جو روایتی طور پر عورت سے رکھتی ہیں۔ اخلاقی پولیسنگ سے پیدا ہونے والے تنازعات، پدرانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی نرم آواز سے سیاست کے دوغلے پن تک، ماحول کی فکر، فرقہ واریت، محبت کی آواز کے ساتھ ساتھ ہندوپاک کی سیاست بھی اس ناول میں سامنے آتی ہے۔

گیتانجلی شری کی زبان صاف ہے۔ ان کے ناول میں جملے بہت مختصر ہیں۔ ناول کے نامکمل جملے بھی سیاق وسباق کو پوری طرح کھلا رکھتے ہیں۔ دھما سے آنسو پتھر کی طرح گرتے ہیں۔ ناول میں کچھ الفاظ بھی ایسے ہیں جو جملے پر بھاری ہیں۔ 'برسات کی بوند' جیسے شاعرانہ جملے اس ناول کو بالکل نیا رنگ دیتے ہیں۔ 'ریت سمادھی' سے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ دیکھیں:

> ''بیٹی کا نچلا ہونٹ رونے سے کانپ رہا تھا اور ماں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ پھر جو ہوا وہ یہ کہ ماں وہ ہونٹ بن گئی جو کانپ رہا تھا۔ بیٹی کا سر کندھے پر رکھ کر اسے بہلانے گنگنانے لگی کی وہ جو بڑا سا ہاتھی ہے، بیٹھی ہے انتظار میں کہ بیٹی آئے، اس کی سواری کرے، اور دونوں جھوم جھوم کریں، اور پتے گپ شپ کر رہے ہیں۔ اور سنو سنو کہانیاں سنا رہے ہیں۔
>
> بیٹی مسکرائی۔ یہ ہوا تو ماں وہ مسکان بن گئی۔
>
> بیٹی کے رونے کی آواز آہستہ آہستہ ٹھہری ہوئی سانسوں میں بدل گئی اور ماں سسکی سے سانس ہو گئی۔
>
> بیٹی سو گئی اور ماں اسے خوابوں سے ڈھانپتی رہی۔
>
> اس وقت ایک محبت پیدا ہوئی۔ ماں اپنی سانس کھوتی رہی، بیٹی کی سانس کھلکھلانے لگی اور ہاتھی کی پیٹھ خوشی سے چیخنے لگی۔''

کبھی کبھی بے جان چیزیں بھی اس ناول میں زندہ ہو جاتی ہیں۔ گیتا نجلی شری نے انہیں کئی بار کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب یہ بے جان کردار زندہ ہوتے ہیں اور اپنے اندرونی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں، تو وہ کبھی پیوند کی طرح نظر نہیں آتے۔ بلکہ وہ ناول کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ ناول کا ایک ایسا حصہ قابل ذکر ہے۔ جس کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

> ”زندگی کا کیا؟ چھوٹے سے دائرے میں چلنا جانتی ہے، جیسے ایک پگڈنڈی پر جو شروع ہوئی نہیں کہ ختم۔ لیکن دیو قامت بھی جانتا ہے، جیسے پگڈنڈی سے کھلی سڑک پر نکل آئے اور بڑی سڑک سے جا ملے جو ایک ہائی وے ہو، گرینڈ ٹرنک روڈ جیسی تاریخی شاہراہ ہو۔ ان کا پگڈنڈی سے دور سے دور جڑ جانا کہانی میں نئے موڑ لاتا ہے، ٹرک ٹریکٹروں کی دہاڑ سے پگڈنڈی تھرا جاتی ہے، یا سلک روٹ سے نکلنے والا ریشمی احساس جو انہیں نرمی سے لپیٹ لیتا ہے۔ پگڈنڈی حیران ہوتی ہے کہ یہ سڑکیں کہاں سے آ رہی ہوں گی، کس وقت سے، قافلوں سے، سرحدوں سے۔ اور اتنی مختلف زندگیوں کو عبور کرنے کے بعد میں کہاں سے آیا ہوں۔ کیا میں اب بھی وہی پگڈنڈی ہوں، یا اس کے بھی پہلے کی تھوڑا سا روش ہوں؟ پر یہ سوال کون پوچھے گا، اب، ابھی کسے خبر؟

ناول ’ریت سمادھی‘ میں کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس بوڑھی عورت (اماں) کا نام چندر پربھا ہے۔ اصل کہانی اس کے شوہر کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اماں نے چارپائی پکڑ لی۔ بیٹا، بہو، پوتا، پوتی سب اپنے اپنے طریقے سے کوشش کرتے ہیں، لیکن اماں ہلتی نہیں۔ ایک دن اماں اپنی چھڑی کے سہارے گھر سے نکلتی ہیں۔ خبر شروع ہوئی تو اماں تھانے میں مل گئیں۔ کچھ دن گھر میں رہی، پھر بیٹی کے گھر چلی گئی۔ بیٹی کی شادی نہیں ہوئی۔ یہیں سے کہانی میں موڑ آتا ہے۔ اماں ایک ٹرانس جینڈر روزی سے ملتی ہیں۔ روزی اماں کے میک اوور میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لباس اور بول چال بالکل بدل جاتی ہے۔ چارپائی پر لیٹی اماں میں نئی توانائی آ جاتی ہے۔ کہانی اپنے تال میں جاری ہے۔ پھر اماں اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ یہ ماضی کی کہانی کی جڑ ہے جس پر شروع میں بحث کی گئی۔ بیٹا، بہو، پوتا سب دل و جان سے مانتے ہیں، لیکن اماں پاکستان کیوں گئیں، کوئی نہیں جانتا۔ جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اماں کی پہلی محبت پاکستان میں تھی۔ چندر پربھا دیوی ہندوستان کی تقسیم

سے پہلے پاکستانی علاقے میں ایک خیراتی ادارے میں تھی۔ ان کی شادی انور سے ہوئی تھی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو وہ جلد بازی میں الگ ہوگئیں اور انہیں ہندوستان آنا پڑا۔ پاکستان کی عطیہ یہاں چندر پربھا بن گئی۔ چندر پربھا نے یہاں شادی کی۔ یہاں تک کہ کہانی نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ناول کے کچھ صفحات بعض اوقات بھاری ہونے لگتے ہیں۔ قیاس آرائیوں کا دور شروع ہوتا ہے کہ اماں کی اس عمر میں پاکستان جانے کی کیا وجہ ہے؟ کبھی ہنسی تو کبھی سنجیدہ قسطیں یہاں سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کیا آپ انور سے ملیں؟ بڑا سوال ہے۔ اس میں جواب مل جائے تو ناول کا آدھا مزہ ختم ہو جائے گا۔ ذہن میں ایک بحث شروع ہو جاتی ہے کہ یہ سرحدیں کیوں ہیں؟ ایک جگہ اماں بھی کہتی ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کہ سرحد کیا ہے؟ وجود کا دائرہ ہے۔ کسی نہ کسی شخصیت کا اپنا اثر ہوتا ہے۔ اماں کی باتیں اسے یہاں سے جذباتی کر دیتی ہیں۔

ادب کی تخلیق میں زبان ایک آلہ ہے، اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسے استعمال کرنے کا ایک فن ہے اور اسے مختلف طریقے سے استعمال کرنے کا ایک الگ ہنر ہے۔ زبان کی مٹھاس، میٹھا بول، الفاظ کہنے کا ہنر، اس کی تلاوت میں نئی آواز ایجاد کرنے کا لطف، بلند آواز سے بولنے کی موسیقی۔ پھنشور ناتھ رینو، راہی معصوم رضا، قرۃالعین حیدر کے ساتھ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ وہ اسے روکے اور بلند آواز میں پڑھے اور اس کی موسیقی میں خوش ہوں۔ 'ریت سمادھی' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ ہیں جو گیتانجلی شری نے اس طرح استعمال کیے، اتنی آسانی کے ساتھ، جیسے پرانے دنوں کو بچا لیا، جیسے ان کے استعمال سے، کوئی آنگن، کوئی میٹھا، کہیں پرانے نیم کے پتے ریچھ سے بھر جائیں، کوئی پرانا آباد گھر پھر سے خوش ہو جائے۔ اس نئے چمکتے بڑے شہر کی عجیب و غریب کیفیت کو اڑا دینا چاہیے۔ اس کی زبان میں روانی ہے۔ اس کے جملے چھوٹے ہو جاتے ہیں اور خوبصورت قہقہوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتے ہیں۔ اس کی گردش میں تازگی ہے، معصومیت ہے۔ اس کے الفاظ بہت مختلف امیج بناتے ہیں اور کچھ ایسے بہاؤ کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں کہ ہر چیز بے ساختہ، بغیر جلد بازی کے، ایک معصوم سی معصومیت کے ساتھ، جیسے بچے کے ہاتھ میں چڑیا ہے۔ گیتانجلی شری کا یہ ناول نہ صرف ہندو پاک سرحد پار کرتا ہے بلکہ تحریر کی ہر حد کو بھی توڑ دیتا ہے۔ الفاظ جملے کی تشکیل کے بغیر اتنے عجائبات کر سکتے ہیں، جو آپ اس ناول میں دیکھتے ہیں۔ کب کہانی سے نظم میں اور کب نظم سے گیت کی طرف، پتہ نہیں چلتا۔ تاہم بعض اوقات یہ تھوڑا سا بوریت بھی پیدا کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ چیزیں زبردستی کھینچی جا رہی ہیں۔ لیکن اگلے چند صفحات پڑھنے کے بعد کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور قاری پھر

سے کہانی میں مگن ہو جاتا ہے اور کہانی میں آگے کیا ہوگا کہ تجسس ہر دھیما پن کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ اس زبان کا کمال ہے کہ پہلے مطالعہ میں کئی حصے پانی کی طرح پھسل جاتے ہیں اور اس کے تاثرات سطح پر پھولوں کی طرح تیرتے ہیں۔ لیکن باب کے شروع میں تجرید کی دنیا بنانے والے بعض حصوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ تمہید روک کر کی جائے، کہ رکنے میں غرق ہونے کا احساس مسلسل ہو۔ عام طور پر ہندی تحریریں کچھ پرانے دھاگے کو برقرار رکھتی ہیں۔ غیر ملکی تحریروں کے برعکس، ایک جمود کا شکار دنیا بار بار دہراتی رہتی ہے۔ لیکن اس ناول میں کچھ نئے دستکاری یا بنائی کے کھیل ہیں۔ توقع ہے کہ اگر کوئی سماجی تناظر، کوئی کہاوت، کوئی اخلاقی پیغام نہ ہو تو اس تحریر کو غیر سنجیدہ کے زمرے میں رکھا جائے۔ گاؤں اور غریب کی کہانی جیسی کوئی کہانی نہیں، شعور اور انقلاب کی کہانی ہے۔ جس طرح کوئی ادیب ادیب نہیں بنا، کوئی اخلاقی مبلغ بن گیا، کوئی سماجی کارکن بن گیا۔

مصنفہ یہ سب کچھ ہے لیکن اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ جتنا سماج میں پیوست ہوتا ہے، اتنا ہی الگ ہوتا ہے۔ وہ ایک دیکھنے والا ہے، تیسرا جو پہلے کو دیکھ کر دوسرے کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کا سیاق وسباق نہ صرف خارجی ہے بلکہ اندر کی دنیا بھی ہے۔ مجھے ہندی کی بہت سی کتابیں یاد آ رہی ہیں جو اس اندرونی دنیا کی عمدہ کاریگری کے لیے ایک سانس کے بعد سانس کھولتی ہیں، ایک تاخیری الاپ کی طرح، جو سارا دن چلتی ہے، رات بھر چلتی ہے، سو صفحات پر چلتی ہے یا عمر بھر۔ نرمل ورما، کرشنا سوبتی، کرشنا بلدیو وید، جیوتسنا ملن، قرۃ العین حیدر، ان دنوں گویا یہ گوہر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ‘ریت سمادھی’ سے پھر وہی احساس جاگتا ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی ملتی ہے جو جس کی مٹھاس کچھ عرصے سے غائب ہو گئی تھی۔ پھر گیتانجلی شری کی تحریروں میں وہی ذائقہ، وہی جمود ہے کوئی ڈرامہ، کوئی دکھاوا، سچائی کی منافقت نہیں۔

گیتانجلی شری کا یہ ناول اس لحاظ سے غیر کہانی ہے۔ جیسا کہ اس نے فیصلہ کیا کہ اس ناول میں وہ روایتی عناصر نہیں ہوں گے۔ پھر سارے بندھن توڑ کر اس نے یوں لکھا جیسے ذہن سوچتا ہے، اُڑ کر اِدھر سے اُدھر، پھر کہاں کہاں۔ شروع شروع میں ایسا لگتا ہے کہ بے ساختہ بہاؤ ہے، بغیر کسی تیاری کے، پھر دھیرے دھیرے یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ اس سیمل کے بیج سے نکلنے والے جنگلی بہاؤ میں بھی ایک ناہموار اور باریک قسم کا کنٹرول ہے۔ اس کے پیچھے ایک ایسا ریاض ہے جو اپنی سراسر سادگی میں اس کے پیچھے کام کو پوشیدہ بنا دیتا ہے۔ تاہم، گیتانجلی شری جو کچھ نہیں کہتی اور نہ سوچتی ہے یا جو کچھ اس نے نہیں لکھا، ان سب کی ایک کہانی بھی ہے جو کہ بہت اہم ہے۔ تصویر میں جو نہیں دکھایا گیا اس کی اہمیت کا احساس بھی ایک منظّم طریقے سے ٹھوس انداز میں ابھرتا ہے۔